مزاحمتی ادب اور ماہنامہ ادبِ لطیف

ڈاکٹر شگفتہ حسین*

Abstract:

In March 1935 Ch. Barkat Ali (Late) started publishing a monthly Urdu literary journal ADAB E LATIF from Lahore. In its beginning it was an ordinary journal but very soon it started projecting Progressive Movement and progressive literature and still it is a known organ of progressive school of thought. It is the policy of ADAB E LATIF to protest against violation of human rights and injustice at every cost. This article illustrates the services it rendered specially for resistant Urdu Literature before and after partition of India. No doubt ADAB E LATIF is a renowned spokesman of those who are resisting injustice and violations all over the world.

کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی غیر مہذب معاشرے کا فرد کیونکہ فطرت کی حیران کن قوتوں سے نبرد آزما تھا اس لیے ابھی اس کی اس جدوجہد کا آغاز نہیں ہوا تھا جو ایک منظّم معاشرے اور ریاست کے وجود میں آنے کے بعد شروع ہوئی۔ تہذیب، معاشرے اور ریاست کے ابتدائی دور سے ہی فرد اور معاشرے کا ٹکراؤ جاری ہو گیا تھا کیونکہ فرد کے مفاد کو ریاست اور معاشرے کے عظیم تر مفاد پر قربان کرنے کا جو سلسلہ چلا وہ آج بھی جاری ہے۔ یوں ''مزاحمت کی تاریخ اتنی ہی پُرانی ہے جتنی جبر کی''۔ انسانی تاریخ ان داستانوں سے بھری پڑی ہے، جن میں کبھی ریاست کے نام

* صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی برائے خواتین، ملتان

پر، تو کبھی مذہب کے نام پر فرد کا استحصال ہوتا ہے اور فرد کبھی بآوازِ بلند اور کبھی خاموش قلم سے سماج کی ان بالا دست قوتوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ حدیثِ نبویؐ میں ہے کہ ''جبر کے ماحول میں پرندے تک گھونسلوں میں مر جاتے ہیں۔'' ادیب تو اپنے معاشرے کا انتہائی حساس فرد ہوتا ہے، اسی لیے وہ اس جبر کی گھٹن اور شدت کو جب اپنے داخل میں اُترتا پاتا ہے تو قلم کو ہتھیار بنا لیتا ہے۔

مارچ ۱۹۳۵ء میں ''ماہنامہ ادبِ لطیف'' کا اجراء ہوا تو ایک طرف انقلابِ روس اور انقلابِ فرانس کے اثرات برصغیر کے رہنے والوں کو متاثر کر رہے تھے اور دوسری طرف کارل مارکس اور دیگر یورپی مفکرین کے نظریات مقبول ہو رہے تھے۔ سیاسی اعتبار سے انگریزی حکومت کے خلاف تحریکیں بھی زور پکڑ رہی تھیں۔ ادبِ لطیف کا اجراء یقیناً اس لیے نہیں ہوا تھا کہ اسے انگریزی حکومت کے خلاف مزاحمت کے لیے استعمال ہونا تھا اور نہ ہی اس کی ابتداء ترقی پسند تحریک کے لیے ہوئی تھی، لیکن ترقی پسند تحریک سے ناتا جوڑتے ہی اس پرچے نے سیاسی جبر کے خلاف ایسی جرأت اور بے باکی کا مظاہرہ کیا کہ جلد ہی مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ اس پرچے میں صرف سیاسی جبر کے خلاف ہی مزاحمت نہیں کی گئی، بلکہ جبر کی ہر اس صورت کو پیش کیا گیا جو معاشرے میں موجود تھی لیکن اس مضمون میں ادبِ لطیف میں طبع ہونے والی صرف ان تخلیقات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت کی ترجمان ہیں۔ اس لیے کہ ادبِ لطیف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ دوسرے رسائل و جرائد کے مقابلے میں ادبِ لطیف نے ہمیشہ حاکمانِ وقت سے ٹکر لی اور احتجاج و مزاحمت کا سلسلہ جاری رکھا۔

اپنے ابتدائی دور میں ہی اس نے ایسی تخلیقات کو طبع کرنا شروع کر دیا جو ترقی پسندانہ رجحانات کی حامل، غلامی سے نفرت اور حریت پسندی کی مظہر تھیں۔ مثلاً نعیم صدیقی کی نظم ''ابلیس کا تفاخر'' (ستمبر ۳۶ء جلد ۳ شمارہ ۷)، الطاف مشہدی کی نظمیں، ''پردیسی اور ہوا کا جھونکا'' (جون جولائی ۳۷ء جلد ۵ شمارہ ۵) ''واسطہ'' (اگست ۳۸ء جلد ۷ شمارہ ۵) ''غلامی'' (دسمبر ۳۸ء جلد ۸ شمارہ ۴) وغیرہ وغیرہ۔

مرزا ادیب نے ادبِ لطیف میں شائع ہونے والے ادب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

> ''ادب اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے اور موجودہ دور جانکنی کی سی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس لیے موجودہ ادب کے سینے میں جہاں خوں فشاں سرخ زخم دکھائی دے رہے ہیں وہاں اس کی گہرائیوں میں بغاوت و انقلاب کی آگ کے آتشیں شعلے بھی بھڑک رہے ہیں، یہی تصویر ہے ہمارے نئے ادب کی۔'' (۱)

ادب کے اس رنگ کی عکاسی کرتے ہوئے مرزا ادیب نے مارچ ۴۰ء (جلد ۱۱ شمارہ ۱) کے شمارے میں

باری علیگ کی کتاب ''کمپنی کی حکومت ہندوستان میں'' پر عطاء اللہ پالوی کا مضمون ''کمپنی کی حکومت ہندوستان میں-میری نظر میں'' شائع کیا۔ اس مضمون میں جوش ملیح آبادی کی نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے'' کے اقتباسات بھی شائع کر دیئے۔ نتیجتاً حکومت نے ادبِ لطیف اور پریس سے مبلغ دو ہزار کی رقم بطور ضمانت طلب کر لی۔ حکومت کو زیادہ اعتراض اس نظم کی اشاعت اور شمولیت پر تھا۔ ضمانت تو جمع کرا دی گئی لیکن اس چکر میں جون کا پرچہ شائع نہ ہو سکا۔ لیکن حکومتی سختیوں کے باوجود ادبِ لطیف کا موقف یہی تھا:

> ''ادب انسانیت کو تقلید و توہمات کی زنجیروں سے آزاد کر کے آزادیٔ فکر اور ولولۂ عمل پیدا کرتا ہے۔''(۲)

غلامی کے اس دور میں ادبِ لطیف کی غزل کا لہجہ مخصوص روایتی نہیں، انقلابی ہے۔ ترقی پسند غزل گو شعراء نے مشرقی جمالیات بالخصوص ایرانی جمالیات کی چند مخصوص روایتوں کو گویا از سرِ نو دریافت کیا تھا۔ مثلاً بلبل، قفس، برق اور نشیمن اُردو شاعری کی کلاسیکی علامتیں ہیں لیکن اب بلبل محض عاشق نہیں بلکہ قوم کی ایک فرد اور ایک غلام انسان کی علامت بن گئی، اسی طرح ''مے'' آزادی اور ''مے خانہ'' آزاد زندگی یا ملک کے تصور سے ہم آہنگ ہو گیا۔ یہ غزل وطن پرستی کی آواز، انقلاب کی دھمک اور طبقاتی کشمکش کو اپنے اندر سموئے اس انداز سے ادبِ لطیف کے صفحات پر ابھری کہ اس کا نیا لہجہ عوام میں تیزی سے مقبول ہونے لگا۔

وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِ نظر سے (۳)

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دوچار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں (۴)

زمیں جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں
کچل کے سر جو اُٹھائیں حریف، فکر نہ کر
کب اڑتی خاک سواروں کی ہم رکاب نہیں (۵)

ناقدین عام طور پر ایسی مزاحمتی اور انقلابی تخلیقات کے بارے میں یہ رویہ رکھتے ہیں کہ ایسی تحریریں وقتی

اور سطحی ہوتی ہیں۔ان میں چیخ و پکار اور زور تو ہوتا ہے لیکن شعریت، نغمگی اور دوام نہیں ہوتا۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں جوش، فیض، مجاز، جذبی، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین اور سلام مچھلی شہری جیسے بہت سے شعراء کی نظمیں اس مخصوص مزاحمت کے رنگ میں ڈوبی ادبِ لطیف میں طبع ہوئیں اور اُردو نظم کی تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ان نظموں کا انقلابی لہجہ ٹھہراؤ کا حامل ہے۔ یہاں دھیمی دھیمی چبھن ہے جو سیاسی جبر کے زیرِ اثر سماجی زندگی کی شکست و ریخت کے سچے احساس سے جنم لیتی ہے۔

تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دل
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے (۶)

مخدوم کی ایک نظم ''اندھیرا'' (مارچ اپریل ۴۲ء جلد ۱۵ شمارہ ۲-۱ ص ۳۸) اور مجاز کی ''مادام'' (جون ۴۲ء جلد ۱۵ شمارہ ۴ ص ۳) بھی ایسی ہی نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔

ادبِ لطیف میں ن۔م۔راشد کی بہت کم نظمیں شائع ہوئیں لیکن جو نظمیں ادبِ لطیف کے صفحات کی زینت بنیں، ان میں راشد کا لہجہ باغیانہ ہے۔ وہ بھرپور علامتی انداز میں غلام قوموں کی بے بسی کو اور پھر غلامی کے خلاف نئی بیداری کو پیش کرتا ہے:

شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی

اور

پردۂ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سُو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ (۷)

ادبِ لطیف کے ابتدائی دور کے افسانے رومانویت کے عکاس ہیں کیونکہ پھر جو افسانہ پرچے میں طبع ہوا وہ ترقی پسندانہ موقف کو پیش کرتا ہے۔ رومانویت بھی ایک اعتبار سے بغاوت ہی کا ایک انداز ہے، جب مخصوص رواجوں اور رسوم سے بغاوت کر کے اپنی ایک الگ دنیا بسالی جاتی ہے۔ادبِ لطیف میں مرزا ادیب کے افسانے جو صحرانورد کے خطوط کے عنوان سے شائع ہوئے مثلاً ''افسانہ خونین'' (دسمبر ۳۵)، ''دخترِ صحرا'' (مئی جون ۳۶)، ''چاہ بابل'' (دسمبر جنوری ۳۸-۳۷ء) وغیرہ وغیرہ داستانوں کی سحر انگیزی اور تحیر خیزی کو حقیقت کے امتزاج کے

ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے قاری کو لق و دق صحراؤں، مصر، بابل اور نینوا کی غلام گردشوں میں لے جاتے ہیں تو قاری ایک نامانوس رومانی فضا کا مزا لینے کے ساتھ مصنف کے اندر چھپی اس خواہش کا ادراک بھی کرتا ہے جو برطانوی راج اور نوآبادیاتی نظام سے پیدا ہونے والی سماجی گھٹن سے نجات پانے کی خواہش ہے اور یہی چیز مرزا ادیب کے افسانوں کو حقیقت سے قریب تر کر دیتی ہے۔

طنز و مزاح رنگ ہے، اسلوب ہے، اسے صنف کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ مزاح کی حس یا ہنسی ایک جبلی کیفیت ہے جسے ادب میں کہیں طنز و مزاح، کہیں بذلہ سنجی اور کہیں ظرافت کا نام دیا گیا ہے۔ ان میں طنز دو دھاری تلوار ہے جو اپنا کام بھی کر جاتی ہے اور نظر بھی نہیں آتی۔ جولائی ۴۴ء جلد ۲۱ شمارہ ۴ سے اکتوبر ۴۴ء تک کرشن چندر کی طنزیہ تحریر ''اردو کا نیا قاعدہ'' قسط وار شائع ہوتی رہی۔ اس میں کھلم کھلا انگریزی حکومت کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''ڈ۔ ڈاکو۔ جب ایک انسان ڈاکہ ڈالتا ہے تو ہم اُسے پھانسی کی سزا دیتے ہیں، لیکن جب چار آدمی مل کر یہ کام کرتے ہیں تو اُنہیں خطاب دیئے جاتے ہیں، قوم انہیں اپنا رہبر سمجھتی ہے۔ بچو اِن ڈاکوؤں سے ہمیشہ بچو۔''(۸)

۱۹۴۷ء کا سال ۱۸۵۷ء سے کسی طرح کم اہم نہیں ہے۔ ۴۷ء کے فسادات نے حساس ذہنوں کو بہت متاثر کیا۔ جب تک انگریز کی حکومت رہی، سامراجیوں سے نجات، ظلم و تشدد کے خلاف احتجاج اور متحد ہو کر نئی آزاد زندگی پانے کا تصور تخلیقات کا محرک بنا رہا۔ مگر آزادی کے ملتے ہی کسی پائیدار زندگی کے تصور کی منزل پریشان خیالیوں میں گم ہو کر رہ گئی۔ ۴۷ء کا دور برصغیر پاک و ہند کا نازک ترین سیاسی انتشار کا دور تھا اور ایسے میں ادبِ لطیف کے اداریے اور نگارشات شدت سے تقسیم کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے۔ مثلاً جون ۴۷ء کے اداریے میں فکر تونسوی لکھتے ہیں:

> ''بیرونی شہنشاہیت نے ایک بین الاقوامی ڈپلومیسی سے اور اندرونی سرمایہ پرست قوتوں نے اپنی متضاد اور خودغرضانہ ملی بھگت سے ہندوستان کو چند غلط اور غیر ترقی پسندانہ حصوں میں بانٹ کر رکھ دیا ہے، ہندوستانی سیاست کی تاریخ نے ایک اہم ترین پلٹا کھایا ہے، اس پلٹے کو ہم انقلاب کی طرف رجحان پیدا کر دینے والا قدم بھی نہیں کہہ سکتے چہ جائیکہ اسے ایک انقلاب کا رتبہ دیں۔''(۹)

۴۷ء کے شماروں میں جو تخلیقات طبع ہوئیں ان میں بھی ان خیالات کی شدت اپنا آپ دکھائے بنا نہیں رہتی۔ مثلاً ظہیر کاشمیری کی نظم ''قاتلوں کا مسکن'' (جون ۴۷ء جلد ۲۵ شمارہ ۳ ص ۲۲)، فکر تونسوی کی ''۱۹۴۷ء'' اور مخمور

جالندھری کی ''تقلید'' (جولائی ۴۷ء شمارہ۴ جلد۲۵ ص۲۹)۔

پاکستان بننے کے بعد ایک نیا نعرہ یہ بھی لگایا جانے لگا کہ خالص اُردو ادب تخلیق کیا جائے اور رجعت پرستی یا ترقی پسندی کا کوئی لیبل نہ ہو۔ ادبِ لطیف کو یہ اعتراض تھا کہ پاکستان میں رجعت پرست اقدامات ہو رہے ہیں اور ان کے خلاف ادیبوں کو احتجاج کرنا چاہیئے ورنہ ان کی تخلیقات زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی امنگ اور رجعت پسند قوتوں سے متصادم ہونے کا ولولہ کھو بیٹھیں گی۔ (۱۰) نئی حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کھلے لفظوں میں اس امر کا اظہار کیا گیا کہ

> ''اسلامی نظام حکومت کے نام پر فسطائی نظام تیار کیا جا رہا ہے اور جو ادارے ایسے نظام کے محرک ہیں ان کو حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔'' (۱۱)

چنانچہ ادبِ لطیف کی یہی باتیں تھیں جن کو بنیاد بنا کر حکومتِ پاکستان نے ستمبر ۴۸ء سے فروری ۴۹ء تک ادبِ لطیف پر پابندی لگا دی۔ لیکن اس کے باوجود ادبِ لطیف کا رویہ یہی رہا کہ تقسیم نے کوئی اچھی صورتِ حال پیش نہیں کی اور پہلے غیروں کے غلام تھے اب اپنوں کی غلامی میں ہیں اور حکمران طبقے کا جبر اور عوام کی بے بسی و مظلومیت ثابت کرتی ہے کہ صبح برائے نام صبح ہے ورنہ اب بھی وہی رات کا اندھیرا ہے۔

قرب ہونے پہ نگاہوں کو یہ عرفان ہوا
آگہی کہتے رہے جس کو وہ گمراہی ہے
جس کو ہم سادہ نظر کہکشاں سمجھے ہیں
وہ بھی فسطائیوں کا نقش کفِ پا ہی ہے
جذبۂ خدمتِ ملت میں ہیں اغراض نہاں
پردۂ عظمتِ جمہور میں بھی شاہی ہے (۱۲)

ادیب سے حکومت سے وفاداری کا تقاضا بھی کیا جانے لگا تھا اور ادب کے پاکستانی ہونے کا ہنگامہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن ادبِ لطیف نے واضح طور پر اعلان کیا کہ ''ادبِ لطیف رجعت پسند اور سرکاری ادب کا ہمنوا نہیں۔'' (۱۳) کنہیا لال کپور کو ترقی پسند تحریک کا اچھا ظریف کہا جاتا ہے، ان کی کئی ایک تحریریں ادبِ لطیف میں شائع ہوئیں۔ انہوں نے ''مکرمی و محترمی'' کے عنوان سے قومی لیڈر، ترقی پسند دوست، ایڈیٹر، اسمبلی کے سپیکر اور ڈائریکٹر فلم کے نام خط لکھے ہیں۔ ''لیڈر کے نام خط'' ملاحظہ ہو:

> ''جب سے حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں آئی ہے، آپ کی تقریریں پڑھ پڑھ

کرادھموا ہو گیا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں تقریریں کرنے کے علاوہ آپ کوئی اور کام نہیں کرتے۔ میں جب اخبار اُٹھاتا ہوں تو اس خیال سے سہم جاتا ہوں کہ حسبِ معمول اس میں آپ کی تقریر ضرور ہوگی۔ ستم یہ ہے کہ آپ ہر تقریر میں وہی بات کہتے ہیں جو مجھے پہلے معلوم ہے یا بالکل غلط ہے۔ مثلاً ایک پاگل خانے کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ''ملک کو پاگلوں کی از حد ضرورت ہے۔'' بندہ پرور خود ہی انصاف فرمایئے کہ سر پھرے قومی رہنماؤں، جاہل ادیبوں، خود غرض پنڈتوں اور مولویوں کی موجودگی میں آپ کا ارشاد کہاں تک درست ہے۔''(۱۴)

اکتوبر ۵۸ء کے مارشل لاء نے پہلی مرتبہ پاکستانی قوم کو فوجی بوٹوں کی سختی سے آشنا کیا۔ ۱۰ سال کا طویل عرصہ اور عدم تحفظ، خوف سیاسی جبر، آزادیٔ اظہار کا فقدان، ان سب عناصر نے مل کر اس عہد کے افسانے کو فرد کی تنہائی، شناخت اور نام کی کھوج اور ذات کی گمشدگی کا افسانہ بنا دیا۔ لکھنے والوں نے سنسر کی پابندی کے خوف سے کھلے لفظ کا چلن ترک کیا اور علامت نگاری اور تجریدیت نے راہ پائی۔

افضال ثانی کا افسانہ ''میں اور وہ'' ادبِ لطیف میں طبع ہوا۔ افسانے کے کردار بے نام ہیں۔ نام جو شناخت کا وسیلہ ہے، کھو جانے کے بعد ''میں''، ''وہ''، ''لڑکی'' اور ''اس'' سے کام چل رہا ہے۔

''میں نے اُسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اسی لیے تو کبھی یقین ہونے لگتا ہے کہ میں وہ ہوں اور وہ میں۔ میرے اندر جو وہ ہے بڑے زور سے چلا کر کہتا ہے کہ ''عین ممکن ہے'' اور وہ ''میں'' ضرور ہے۔ پھر یہ مسئلہ اور بھی گنجلک ہو جاتا ہے۔''(۱۵)

شناخت کھو جائے تو انسان بھرے ہجوم میں تنہا رہ جاتا ہے اور یہ تنہائی اسے تشکیک میں مبتلا کرنے کے ساتھ عدم تحفظ اور خوف کا شکار کر دیتی ہے۔

''میں ایک تنہا اور خوف زدہ انسان، ایک دوسرے تنہا خوف زدہ انسان کے سینے کے ساتھ سر لگائے سسکیاں بھر رہا تھا اور تمام کائنات میں سائیں سائیں کرتی تنہا رات بھری تھی۔''(۱۶)

ادبِ لطیف کی اس دور کی نظم اور غزل بھی اسی صورتِ حال کی ترجمان ہیں مثلاً؛

جو ساحلوں کو پھاندتا، صدی کا جسم چیرتا
زمیں میں ہے سرنگوں
زمیں کی آنکھ نم، زمیں کا جسم تار تار
کوکھ بھی لہولہو
مرا سپوت باغیوں سے جا ملا(۱۷)

کسی بھی ملک وقوم کی تاریخ میں وہ دور بدترین دور ہوتا ہے جب اس کے مظلوم عوام پر آمر مطلق، مذہب کے اجارہ دار اور انتظامی مشینری کے کرتا دھرتا اپنا مخصوص گٹھ جوڑ کر کے حکومت کرتے ہیں۔ پاکستانی عوام نے اس ''سہ فریقی اتحاد'' کا ظلم اور ذلت دوسری مرتبہ جولائی ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء میں برداشت کیا۔ یہ مارشل لاء اس اعتبار سے زیادہ سنگین تھا کہ عوام کی منتخب کردہ حکومت کو چور دروازے سے داخل ہو کر ختم کر دیا گیا۔ منتخب وزیر اعظم کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور احتجاج کرنے والوں کو شاہی قلعے کے پراسرار تہہ خانوں میں نظر بند کرنے کے ساتھ کوڑوں کی سزائیں عام کر دی گئیں۔ یہ سزائیں انسانیت کی تذلیل تھیں۔ حساس ادیب اور شاعر اس موقعے پر ایک بار پھر خاموش نہ رہ سکے۔ ان دنوں ایسا شاندار اجتماعی اور مزاحمتی ادب تخلیق ہوا جس کی مثال اردو ادب میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ حیرت انگیز طور پر اس موقع پر، اوراق، فنون اور نقوش کی طرح ادبِ لطیف نے بھی خاموشی اختیار کئے رکھی۔ ناصر زیدی کی زیرِ ادارت ۱۹۸۰ء تک جو پرچے طبع ہوئے ان میں مزاحمت اور احتجاج کا کوئی رنگ کوئی انداز نہیں ملتا۔ نقوش اوراق اور فنون تو مستقل خاموش رہے لیکن ادبِ لطیف کی خاموشی عارضی ثابت ہوئی۔

جنوری ۱۹۸۱ء میں ناصر زیدی پرچے سے الگ ہوئے اور ادبِ لطیف مدیرِ اعلیٰ محترمہ صدیقہ بیگم دُختر بانی ادبِ لطیف چودھری برکت علی نے سنبھال لیا۔ ان کے اعزازی مدیروں میں محترمہ کشور ناہید سرفہرست تھیں۔ صدیقہ بیگم نہایت بے خوف، باحوصلہ اور جرأت مند خاتون ہیں۔ انہوں نے ظلمت کے اس قابل نفرت دور میں اپنے دوستوں خصوصاً کشور ناہید، غالب احمد اور ذوالفقار تابش وغیرہ کے ساتھ مل کر پرچے کو جرأت اظہار کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیا۔ آج بھی ادبِ لطیف ان ہی کی زیرِ نگرانی مستقل مزاجی سے اپنی آزاد خیالی کی روش پر گامزن ہے۔

جنوری ۸۱ء سے دسمبر ۸۵ء تک کے درمیانی عرصے میں ادبِ لطیف اک زندہ پرچے کی حیثیت سے ابھرا۔ اس نے حاکموں کی سسر شب کی پابندیوں کے باوجود سیاسی جبر، ظلم، ناانصافی، خوف، عدم تحفظ اور ملاازم کے خلاف احتجاج کیا اور یوں ''روحِ عصر'' کی بھرپور ترجمانی کی۔

جنوری ۸۱ء کے پرچے میں ''نظمیں'' کے عنوان سے ایک آدمی کی تصویر بنائی گئی جس کے ہاتھ اور بازو کٹ چکے ہیں، لیکن وہ پاؤں سے لکھ رہا ہے۔ اس تصویر پر سنسر کے کرنل نے اعتراض کیا تو کشور ناہید بتاتی ہیں کہ انہوں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ یہ تصویر دراصل اس امر کی دلیل ہے کہ ہمارے لکھنے والوں کی تحریریں اس قدر بری ہیں کہ ہاتھ تو ہاتھ پیروں سے بھی نہیں لکھ سکتے۔ اِن دنوں کئی ایک لکھنے والوں کے ناموں کو بدل کر سنسر سے پاس کرا لیا جاتا اور چھپائی کے وقت نام صحیح کر دیئے جاتے۔ (یہ باتیں محترمہ کشور ناہید نے مجھے ایک انٹرویو کے دوران بتائیں جو جولائی ۱۹۹۹ء میں لیا گیا)

جنوری ۸۱ء کے شمارے میں فہمیدہ ریاض کی نظم ''سرشام''سرمد صہبائی کی ''ایک سجدہ''صلاح الدین محمود کی ''نظم''افتخار عارف کی ''سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں''اور ''اصغر ندیم سید'' کی ''عظیم نقصان کے بعد'' ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر علامت کا سہارا لیتا ہے اور اس سیاسی جبر کے خلاف نفرت کا اظہار کرتا ہے۔

کبھی آسمانوں سے حرفِ مناجات ساون کی آنکھوں سے
آنسو ہواؤں سے
لمبے سفر کی حکایت
غلاموں کے دامن سے آزاد صبحوں کی ساعت گرے
تو اُسے مت اٹھانا (۱۸)

تبسم کاشمیری کی نظم ''تم اپنے جسموں کی یہ فصیلیں''جابر حاکم کے سامنے سر نہ جھکانے کی تلقین کرتی اور سر پر لہو کے پیالے سجانے کی ترغیب دیتی ہے۔

''ہوا کے شعلوں سے جسم جل جل کے
گر رہے ہیں
خلا کا سینہ لہولہو ہے
تمہارے سر کو کڑک کے کچلے جو کوئی بھی
نہ سر جھکانا
تم اپنے سر پہ لہو کے پیالے سجائے رکھنا (۱۹)

افتخار عارف خزاں کے موسموں میں بشارت دینے والا موسم مانگتے ہیں کہ خوف سے بھری فضاؤں میں اب اور سانس لینا محال ہے۔

خداوندا تجھے سہمے ہوئے باغوں کی سوگندھ
صداؤں کے ثمر کی منتظر شاخوں کی سوگندھ
اڑانوں کے لیے پَر تولنے والوں پر اک سایۂ تحفظ کی ضمانت
دینے والا
کوئی موسم بشارت دینے والا (۲۰)

ان کے علاوہ ادبِ لطیف ستمبر اکتوبر ۸۲ء (جلد ۴۸ شمارہ ۱۰-۹) میں طبع ہونے والی غالب احمد کی ''نظم''

حسن عباس رضا کی ''محبت کے لیے ایک نظم''، احمد سہیل کی ''موت سے پہلے ایک نظم'' اور ''میں خواب سنانا چاہتا ہوں''، اپریل ۸۲ء (جلد ۴۸ شمارہ ۴) میں احمد مشتاق کی ''ایک نظم''، ایوب خاور کی ''ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ'' ستمبر ۸۳ء (جلد ۴۹ شمارہ ۹) میں نذیر قیصر کی ''ہوا راستہ نہ روکے تو کہاں جاؤں''، احسن علی خاں کی ''دن خریدے گا کون''، انور زاہدی کی ''آسمانِ شب میں'' جنوری فروری ۸۴ء (جلد ۵۰ شمارہ ۲-۱) میں فارغ بخاری کی نظمیں ''کہا تھا بار ہا ہم نے''، ''مشورہ'' اور ''اسمِ اعظم''، مئی جون ۸۵ء (شمارہ ۱۵ جلد ۶-۵) میں احسن علی خان کی ''سچ کی سزا''، اصغر ندیم سید کی ''ان کو ہنس لینے دو'' ستمبر اکتوبر نومبر ۸۱ء (جلد ۴۷ شمارہ ۱۱، ۱۰، ۹) میں عباس اطہر کی ''اگر''، اور مارچ ۸۱ء (جلد ۴۷ شمارہ ۳) میں جاوید شاہین کی ''عذاب لانے دو'' اور افضال احمد سید کی ''ایک پاگل کتے کا نوحہ'' میں حساس شاعروں کے دل دھڑکتے ہیں۔ جبر کی فضا علامت کو بہت راس آتی ہے اور ہمارے شاعروں نے علامت نگاری کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔

غزل جس کا مزاج ہر رجحان کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے، لیکن اس کی ہیئت برقرار رہتی ہے۔ اس صنف نے جتنی ''آزادی'' میسر تھی اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مزاحمت کی روایت کو برقرار رکھا اور ادب لطیف کے صفحات پر ادب کی ایک نئی تاریخ رقم کر دی۔ ہر وہ شاعر جو اپنی ذات اپنے فن سے وفاداری نبھانا جانتا تھا اور جسے چند ٹکوں کے عوض اپنا فن بیچنا گوارہ نہ تھا اس نے جبر و ظلم کو بے نقاب کرنے کے لیے غزل کی صنف کا سہارا لیا اور ادبِ لطیف میں طبع ہوا۔ مثلاً محسن احسان (فروری ۸۱ء جلد ۴۷ شمارہ ۲) فارغ بخاری (اگست ۸۱ جلد ۴۷ شمارہ ۸) ستار سید (اگست ۸۱ء) ظہور نظر (جنوری ۸۱ء جلد ۴۷ شمارہ ۱) محمد خالد (اپریل ۸۱ء) احمد فراز (جنوری ۸۱ء) باقر مہدی (اپریل ۸۱ء) نذیر قیصر (مئی ۸۱ء) شہرت بخاری (جون ۸۱ء) ظفر اقبال (ستمبر اکتوبر ۸۲ء جلد ۴۸ شمارہ ۱۰-۹) مظہر امام (ستمبر اکتوبر ۸۲ء) حسن عباس رضا (ستمبر اکتوبر ۸۴ء جلد ۵۰ شمارہ ۱۰-۹) محسن بھوپالی (ستمبر ۸۳ء جلد ۴۹ شمارہ ۹) اور حبیب جالب (ستمبر اکتوبر نومبر ۸۱ء) وغیرہ۔

۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو ملک کی ایک بڑی اکثریت کے پسندیدہ اور منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے کر فوج نے اپنے تئیں پورے ملک پر قبضہ کر لیا، لیکن اس پھانسی سے شدید ردِ عمل ہوا۔ یہ دور ادیبوں کی ذمہ داریوں کا کڑا امتحان تھا اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ انہوں نے اپنی اس ذمہ داری کو نبھانے کی پوری کوشش کی۔ عام طور پر یہی تاثر پایا جاتا ہے کہ ایمائیت اور علامت نگاری شعری ادب کو زیادہ بھاتی ہے، کیونکہ شعری ادب میں علامتی اظہار کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود ادبِ لطیف میں افسانے کا کردار کچھ ایسا کم بھی نہیں رہا۔ افسانہ نگار بھی اس پُر آشوب دور میں اپنے قلم کو ہتھیار بنا کر لڑتے رہے۔ مجموعی طور پر افسانہ نگاروں کو بھی اس بات کا

احساس تھا کہ انہوں نے روحِ عصر کی ترجمانی کا فریضہ انجام دینا ہے۔ رشید امجد کے افسانے ''بے زمین'' کے کردار کانوں اور آنکھوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں لیکن یہ سب ہر احساس سے عاری ہیں۔ مزاحمت کا حوصلہ ہے نہ احتجاج کا۔ فوجی بُوٹ تلے کراہتی قوم کو معلوم ہی نہیں کہ یہ سب اگر خواب ہے تو یہ خواب ختم ہونے میں نہیں آتا اور اگر حقیقت ہے تو:

''اس شام وہ باہر نکلا تو اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ شہر میں بہت کے کان کٹے ہوئے ہیں۔ چند دن اجنبی اجنبی سے لگے اور پھر اُسے یاد بھی نہیں رہا کہ اس کے کان نہیں ہیں۔'' (۲۱)

روشنی اس دور میں کچھ ایسی رُوٹھی تھی کہ کسی پکار پر نہ پلٹتی تھی۔ رات ایسی آئی تھی جس کی سحر نہ تھی۔ ڈاکٹر انوار احمد پر اس اندھیرے میں یہ بھید کھلا تھا کہ ہاتھی والے گریہ کرنے کا بھی حق نہ دیتے تھے:

''اور پھر جو رات آئی تو اس کی صبح نہ ہو سکی۔ کچھ دیر بعد ہم میں جو ہوش میں آیا وہ رونے لگا۔ تبھی فوراً ایک سایہ اس پر جھپٹا، جس کے سینے اور ماتھے پر ہاتھی والوں کا نشان کندہ تھا۔ تب ہم پر کھلا کہ ہمیں گریہ کرنے کا حق بھی نہیں کہ مبادا ہم سکتے کی حالت سے باہر آ جائیں۔'' (۲۲)

رشید امجد کو لوگوں کی بے حس خاموشی پر اعتراض ہے۔ دراصل عام آدمی کا احتجاج مارشل لاء کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ جب تک ریاستی کرتا دھرتا آواز بلند نہ کرتے۔ جمہوریت کے قتلِ عام پر واویلا نہ کرتے لیکن ان کے لفظ گم ہو گئے تھے۔ ایک کے پاس لفظ ہی نہ تھے کہ اس نے اپنے لفظ کسی کو ادھار دے دیئے تھے۔ دوسرے کے پاس لفظ تھے مگر جواب نہیں تھا، تیسرے کے پاس لفظ بھی تھے اور جواب بھی، لیکن وہ بولتا نہ تھا چنانچہ

''ایک عجیب قسم کی ذلیل اور بے غیرت خاموشی چاروں طرف چوکڑی مارے بیٹھی ہے۔'' (۲۳)

سکون اور اطمینان کے فقدان اور خوف نے فطرت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ احمد داؤد کے افسانے ''جھیل، جنگل، قدیم بوڑھا'' کا جنگل اور جھیل زمانوں سے قائم تھے، لیکن پھر جنگل کٹے، لوگ کم ہوئے، جنگل میں بیرکس بنیں، چاند ماری کے میدان بنے، جہاں پرندے بولتے تھے، وہاں چاند ماری کے بارود کی بُو پھیل گئی۔ جنگل کاٹنے کے ساتھ جھیل کو خشک کرنے کی باتیں شروع ہوئیں تو مچھلیاں کسی اور جھیل میں چلی گئیں۔ شہر کی حالت جنگل سے بھی بُری تھی کہ وہاں پابندی تھی، جگہ جگہ چیک پوسٹیں تھیں، اجازت نامے کی قدغن تھی۔

''جب سے اپنوں اور غیروں کی پہچان ختم ہوئی ہے شہر میں شبے کی دہشت گشت کرتی رہتی ہے۔ کسی وقت بھی روکا جا سکتا ہے۔ سلاخوں کے پیچھے بند کیا جا سکتا ہے۔'' (۲۴)

ان مذکورہ بالا مثالوں کے علاوہ احمد داؤد کا ''کولاج۔ کٹی ہوئی لکڑیاں'' (جون ۸۱ء) ڈاکٹر انوار احمد کا ''قومی مفاد میں مرتب کی جانے والی ایک رپورٹ کا خلاصہ'' (ستمبر اکتوبر ۸۴ء) آغا سہیل کا ''نوشتۂ دیوار'' (مئی

جون۸۴ء) سریندر پرکاش کا ''گاڑی بھر رسد'' (اگست ۸۱ء) اسلم فرخی کا ''کہانی ختم'' (اگست ۸۱ء) اور احمد بشیر کا ''شناخت'' (اگست ۸۱ء) ایسے افسانے ہیں جو جبر واستبداد کی قوتوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

افسانے اور شاعری سے ہٹ کر بھی کچھ ایسی تحریریں ان دنوں ادبِ لطیف میں طبع ہوئیں جن کی اشاعت کاروباری اعتبار سے ادبِ لطیف کو نقصان پہنچا سکتی تھی لیکن صدیقہ بیگم جیسی باحوصلہ، جرأت مند خاتون نے ان حالات میں پرچے کی اشاعت نہ صرف برقرار رکھی بلکہ حاکموں کی جھوٹی خوشامد کرنے یا خاموش رہ کر ظلم کی روایت کا حصہ بننے سے بھی انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنے مدیروں کو کبھی بھی ایسی تحریروں کی اشاعت سے منع نہیں کیا۔ اسی لیے مارچ ۸۱ء (جلد ۴۷ شمارہ ۳) میں فلسطینی مصور ''برہان قرقطلی'' کی تصویروں کے عکس اور تعارف انتہائی جرأت کے ساتھ طبع کیا گیا۔ منّو بھائی کا ترجمہ شدہ یہ تعارف صریحاً مارشل لائی طاقتوں کے خلاف ہے۔ برہان قرقطلی نے اپنی تصویروں کے ذریعے استحصال اور جبر کی چکی میں پستے ہوئے عوام کو ان کے حقوق اور مفادات کا احساس دلایا، ان کے حصول اور تحفظ کا حوصلہ دیا۔ ادبِ لطیف کا یہاں یہ کہنا کہ ہماری روایت ان لوگوں کی روایت ہے جو ظالم سے نفرت اور مظلوم سے محبت کرتے ہیں جن کے ہیرو حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ ہیں اور جو یزید کو پلید اور شمر کو لعین کہتے ہیں خاصا معنی خیز ہے۔ اسی طرح اپریل ۸۱ء (جلد ۴۷ شمارہ ۴) میں اسپین کے مصور ''گویا'' کی تصویروں کا عکس اور تعارف بھی سبھی کو چونکا گیا کہ ''گویا'' انسان ــــــ کائنات کی سب سے حسین تخلیق کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی اور حالات وواقعات کی سفا کی کو موضوع بناتا ہے۔

جب اس قسم کی صورت حال درپیش ہو تو ادیب اور شاعر عام طور پر تراجم کا سہارا لیتے ہیں کیونکہ ترجمے کا مقصد ایک تو کسی بڑی تخلیق سے حاصل ہونے والی خوشی کو اپنی روح میں اتارنا ہے اور دوسرے جب اظہار پر پابندی ہو تو دوسری زبانوں کی تخلیقات کو اپنے دل کی آواز بنانا ٹھہرتا ہے۔ ادبِ لطیف میں آزادی سے پہلے ایسے تراجم طبع ہوئے جن میں انقلاب کا پیغام تھا مثلاً ماؤتسی تنگ کا افسانہ ''انقلاب احمری'' (مترجم محمد اشرف خان عطاء، جنوری ۴۰ء) اور سروجنی نائیڈو کا افسانہ ''ہندوستان'' (مترجم محمد اشرف خان عطاء، فروری ۴۰ء) آرنلڈ بینٹ کا ڈرامہ ''جودت'' (مترجم سراج الدین احمد نظامی، فروری مارچ ۳۹ء) اور تنگ لنگ کا ڈرامہ ''چین کے لیے'' (مترجم خلیق ابراہیم، دسمبر ۳۹ء) وغیرہ۔ آرنلڈ بینٹ کا ترجمہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ وہ آئرش تھا اور آئرلینڈ اور ہندوستان میں چلنے والی آزادی کی تحریکیں اپنی بنیاد اور پس منظر کے اعتبار سے ایک جیسی تھیں۔ یوجین اونیل اور وکٹر ہیوگو ایسے یورپی ادیب ہیں جو ہمیشہ انتظامی مشینری کے ہتھ کنڈوں کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد ادیبوں کو جس انداز سے سرکاری ادب تخلیق کرنے پر مجبور کیا گیا اس کے پیشِ نظر ۵۰ء کی دہائی میں ان کے ڈراموں کے تراجم معنی

خیز ہیں۔ادبِ لطیف اپریل ۵۳ء میں محمد عمر مہاجر کا ترجمہ شدہ وکٹر ہیوگو کا ڈرامہ ''مجرم کون'' طبع ہوا جبکہ اپریل ۵۷ء میں یوجین اونیل کا ڈرامہ ''واہمے'' (مترجم سید سجاد ترمذی) اور دسمبر ۵۷ء میں یوجین ہی کا ''پیسہ'' (مترجم اظہار کاظمی) طبع ہوا۔

۱۹۸۰ء میں صدیقہ بیگم کی نگرانی میں تراجم کی ایک نئی تاریخ مرتب ہوئی۔مغربی ادب کا مطالعہ صدیقہ بیگم کی ذات کا حصہ ہے لہٰذا ان تحریروں کو وہ خود منتخب کرتیں۔اِس دور میں افسانے اور نظمیں انہی ادیبوں،شاعروں کے منتخب ہوئے جو ہمیشہ معاشرے کے سیاسی وسماجی جبر کے خلاف صف آراء رہے۔مثلاً مئی ۸۱ء میں چیخوف کا افسانہ ''نظرِ ثانی'' (مترجم ستار طاہر) طبع ہوا۔اس کے علاوہ کاتیول سپندیز کے افسانے ''آئینہ'' (جولائی ۸۱ء) اور فرخ ڈھونڈی کے افسانوں ''سانپ کی دم پر نمک'' (جون ۸۲ء) اور ''نجات'' (نومبر دسمبر ۸۲ء) اور یحییٰ نجیف کے افسانے ''بچھیری'' (جولائی ۸۲ء) کا بھی ترجمہ کیا ہے۔یہ افسانے مزاحمتی ادب کے بہترین نمونے ہیں۔

اس دَور میں عالمی ادب کی شاعری کے تراجم بھی طبع ہوئے۔ان شعراء میں خصوصیت سے چیسلا وَ میلوہش (جنوری ۸۱ء) این سا ڈوسکی (مارچ ۸۱ء) میزنی کونین (مارچ ۸۱ء) ہرمن ہیسے (اگست ۸۱ء) احمد شاملو (اپریل ۸۱ء) لینگسٹن ہیوز (مارچ ۸۱ء اور نومبر ۸۳ء) فروغ فرخ زاد (جون ۸۱ء اور جولائی ۸۱ء) محمود درویش (جولائی اگست ۸۲ء) صالح عبدالصبور (نومبر دسمبر ۸۶ء) ڈینس برُوٹس (مارچ ۸۱ء) اینا زائڈل (مئی ۸۱ء) رینے شار (مئی ۸۱ء) ہورسٹ بینک (ستمبر اکتوبر ۸۲ء) مونیکا لاہا (ستمبر اکتوبر ۸۴ء) اور اجیش جوشی (ستمبر اکتوبر ۸۲ء) قابلِ ذکر ہیں۔لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کئی ایک شعراء کے کلام کا ترجمہ شائع کرنے کے ساتھ ان کا تعارف بھی ہے اور یہ تعارف اس دَور کے شعراء کے حوصلوں کو مہمیز دیتا ہے۔مثلاً چیسلا وَ میلوہش ۱۹۸۰ء کا نوبل انعام یافتہ شاعر ہے۔اس کی نظموں کا ترجمہ منّو بھائی نے کیا ہے۔چیسلا وَ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ نوبل انعام یافتہ شاعر دوسری جنگِ عظیم میں وارسا میں نازیوں کے خلاف مزاحمتی تحریک کا سرگرم رکن بنا اور نازیوں کے خلاف نظموں کا ایک مجموعہ خفیہ شائع کرایا۔ایسے شاعر کو اس دَور میں متعارف کرانا اور کلام کا ترجمہ کرنا ادبِ لطیف ہی کا کام ہے۔ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کا تعارف بھی معنویت رکھتا ہے۔۱۹۶۶ء میں جب ایران میں پہلوی دہشت ایک نئے انداز سے اُٹھ رہی تھی،شاہ کے مخالف موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے،بدنام زمانہ ساوک کی کارروائیاں جاری تھیں،احمد شاملو نادر نادر پور،ف۔م۔اسفندیاری کی طرح فروغ فرخ زاد خوف و ہراس کی خندقوں میں ادب تخلیق کر رہی تھی اور آخر ۳۲ سال کی عمر میں ٹریفک کے ایک ''حادثے'' میں اُسے ختم کر دیا گیا۔نگاہیں ساوک کی طرف اُٹھیں لیکن اُنگلی نہ اُٹھی کہ اس کا کٹ جانا لازمی تھا۔فروغ فرخ زاد کی شاعری کا ترجمہ دیکھیں:

اے دوست! اے بھائی! اے میرے خون کے رشتے دار
جب تم چاند پر پہنچو
تو وہاں پھولوں کے قتلِ عام کی تاریخ درج کرا دینا(۲۵)

''پابلونرودا۔زمین کا بیٹا'' کے عنوان سے پابلو کی یادداشتوں کے اقتباسات مظفر اقبال نے ترجمہ کیے ہیں، ملاحظہ کریں:

''وہ عظیم لاش چلی کے فوجیوں کی گولیوں سے چھلنی تھی،
فوجی، جنہوں نے
ایک دفعہ پھر مادرِ وطن سے غداری کی تھی۔''(۲۶)

مزاحمتی ادب میں ادبِ لطیف کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے ارادی طور پر ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء زیادہ زیرِ بحث رہا۔شاید اس لیے کہ ملک وقوم کو جتنا نقصان اس مارشل لاء نے پہنچایا اور جن خرابیوں کو دانستہ پروان چڑھایا ان کو مدِ نظر رکھا جائے تو شاید میرا تعصب قابلِ معافی ہو۔اس سارے جائزے سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ مزاحمتی ادب جتنا شاعری میں تخلیق ہوتا ہے، اتنا نثر میں نہیں، کیونکہ مجھے نظم اور غزل کی مثالیں تو اکثر ملیں لیکن افسانے اس اعتبار سے کم ہیں جن میں سیاسی جبر کے خلاف احتجاج کیا گیا ہو۔اس کے علاوہ ایک اور بات جو میرے مشاہدے میں آئی وہ یہ کہ ایوب خان کے مارشل لاء دور میں عام طور پر پابلونرودا، ناظم حکمت، فروغ فرخ زاد، محمود درویش اور لورکا وغیرہ کو ترجمہ کیا گیا لیکن ادبِ لطیف میں ان دنوں بورخیس، جیمز جوائس اور کافکا کو ترجمہ کیا گیا، شاید اس لیے کہ اِس دور میں ادبِ لطیف کی ادارت انتظار حسین، سید قاسم محمود اور ذکاء الرحمٰن وغیرہ کے ہاتھ میں تھی اور وہ ایسے احتجاج کو غالباً ترقی پسندی تصور کرتے تھے لیکن بعد میں ۷۷ء کے مارشل لاء کے خلاف ۱۹۸۰ء میں ادبِ لطیف نے احتجاجی ومزاحمتی ادب کی اشاعت کھل کر کی اور تب پابلونرودا اور فروغ فرخ زاد وغیرہ کو بھی ترجمہ کیا گیا۔

بہر حال کچھ بھی سہی، عصری رجحانات اور رویوں کو پیش کرنا، روحِ عصر کی ترجمانی کرنا اور رجعت پسند قوتوں سے ٹکرانا ہمیشہ ادبِ لطیف کی حکمتِ عملی رہی اور ادبِ لطیف نے اس جنگ میں حکومتی بندشوں، مقدموں اور جرمانوں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔لیکن کوئی بھی بندش اُسے حق بات کہنے سے نہ روک سکی۔ادبی جرائد کی تاریخ میں جب کبھی بھی مزاحمتی ادب کا ذکر ہوگا کوئی بھی محقق اس حقیقت سے انکار نہیں کرے گا کہ جب بڑے بڑے جرائد خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے، ادبِ لطیف حضرت علیؓ کے مشہور قول کی تفسیر تھا کہ اس نے اس وقت زبان کھولی جب سب گنگ نظر آتے تھے۔گو اس کی آواز سب سے دھیمی تھی مگر سبقت وپیش قدمی میں سب سے آگے تھی۔!!!

حوالہ جات

۱۔ مرزا ادیب، اداریہ، سال نامہ ۳۹-۴۰ء، دسمبر، جنوری (جلد ۱۰ شمارہ ۵-۴)

۲۔ مرزا ادیب، اداریہ، جون جولائی ۴۰ء (جلد ۱۱ شمارہ ۴-۵)

۳۔ فیض، احمد فیض، ''غزل'' اگست ۴۱ء (جلد ۴۱ شمارہ ۱)، ص ۲۲

۴۔ جذبی، معین احسن، ''غزل''، جنوری فروری ۴۳ء (جلد ۱۶ شمارہ ۴-۵) ص ۳۱

۵۔ فراق گورکھپوری، ''غزل''، اکتوبر نومبر ۴۳ء (جلد ۱۸ شمارہ ۲-۳) ص ۳۹

۶۔ فیض، احمد فیض، ''سیاسی لیڈر کے نام''، مئی ۴۲ء (جلد ۱۵ شمارہ ۳) ص ۳۰

۷۔ راشد، ن۔م، ''زنجیر''، سال نامہ جنوری ۴۲ء، ص ۴۳

۸۔ کرشن چندر، ''اردو کا نیا قاعدہ''، ستمبر ۴۴ء، ص ۵

۹۔ فکر تونسوی، اداریہ، جون ۴۷ء (جلد ۲۵ شمارہ ۳) ص ۲

۱۰۔ فکر تونسوی اداریہ، اگست ۴۸ء (جلد ۲۷ شمارہ ۵) ص ۲

۱۱۔ عبداللہ ملک، ''ادب اور فسطائیت''، مارچ اپریل ۴۸ء (جلد ۲۶-۲۷ شمارہ ۱-۶) ص ۲۶

۱۲۔ فارغ بخاری، غزل، اپریل مئی ۴۹ء (جلد ۲۸ شمارہ ۱-۲) ص ۸۷

۱۳۔ مرزا ادیب، اداریہ بہ عنوان حرفِ اوّل، جنوری ۵۲ء (جلد ۳۳ شمارہ ۴) ص ۴

۱۴۔ کنہیا لال کپور، ''لیڈر کے نام خط''، اپریل مئی ۴۹ء (جلد ۲۸ شمارہ ۱-۲) ص ۵۵

۱۵۔ افضال ثانی، ''میں اور وہ''، اپریل ۶۲ء (جلد ۵۰ شمارہ ۴) ص ۵۰

۱۶۔ خالدہ اصغر، ''ایک بوند لہو کی''، مارچ، اپریل ۶۳ء، ص ۱۲۲

۱۷۔ انیس ناگی۔ ''قتل''، جولائی ۶۰ء، (جلد ۴۷، شمارہ ۵) ص ۲۰

۱۸۔ اصغر ندیم سید ''عظیم نقصان کے بعد''، جنوری ۸۱ء ص ۲۳

۱۹۔ تبسم کاشمیری، ''تم اپنے جسموں کی یہ فصیلیں'' مارچ ۸۱ء (جلد ۴۷ء شمارہ ۳) ص ۶۲

۲۰۔ افتخار عارف، ''خزاں کے موسم میں لکھی گئی ایک نظم''، اپریل ۸۱ء (جلد ۴۷ شمارہ ۴) ص ۱۰۱

۲۱۔ رشید امجد، ''بے زمین''، جنوری ۸۱ء (جلد ۴۷ شمارہ ۱) ص ۶۲

۲۲۔ انوار احمد، ''درداں دی ماری دلڑی علیل اے''، مارچ ۸۱ء ص ۱۰۹

۲۳۔ رشید امجد، ''ثمر سے بے ثمر پیڑوں کی جانب''، جولائی ۸۱ء ص ۶۰

۲۴۔ احمد داؤد، ''جھیل، جنگل، قدیم بوڑھا''، مئی جون ۸۳ء ص ۳۶

۲۵۔ فروغ فرخ زاد، ''اندھیرے میں'' جون ۸۱ء، ص ۹

۲۶۔ پابلو نرودا، جنوری فروری ۸۴ء (جلد ۵۰ شمارہ ۱-۲) ص ۱۴